# ”کئی چاند تھے سر آسماں“ مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

# POST COLONIAL STUDY OF THE NOVEL “KAI CHAND THY SARE AASMAAN”

افشاں سحر* / ڈاکٹر یاسمین سلطانہ**

**Abstract:**

Colonialism refers to the combination of territorial, juridical, cultural, linguistic, political, mental, and economic domination of one group of people or groups of people by another (external) group of people. European colonialism refers to the various formulas of territorial domination effected by European powers upon non-European people from the late 1400s to the mid- to late 1900s. Urdu fiction went through a substantial change during the colonial period. The colonial discourse narrated and disseminated through different technologies of educational subjugation and epistemological usurpation in official and historical works brought forth some serious changes in the world view of Urdu fiction writers. They discovered and presented the subjectivity of the colonialized. This essay presents post-colonial impacts in the novel of Shamsu Rehman Farooqui’s novel “Kai Chand thy Sare aasmaan”

**Key words:** colonialism, post colonialism, Urdu fiction, Urdu novel, shams ur Rehman Farooqui, Kai Chand thy sar e asman, the mirror of beauty.

*پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی

**چیئرپرسن، شعبہ اُردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی

اردو زبان و ادب میں انگریز تسلط اور سامراجی قوتوں کے زیر سایہ وجود میں آنے والی صنف نثر "ناول" بیانیہ صنف ادب ہے جس میں ایک مربوط قصے کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں نیز کسی بھی مخصوص موضوع کا احاطہ ادبی پیرائے میں کرداروں اور واقعات کے تفصیلی بیان سے کیا جاتا ہے۔ مصنف کا اسلوب بیان اس کے حسن کو ندرت بخشتا ہے۔ حقیقت میں اطالوی زبان کے لفظnovellaسے ناول بطور اصطلاح رائج ہوا۔ اردو میں یہ صنف انگریزی زبان و ادب میں تحریر کردہ ناولوں سے متاثر ہو کر اپنائی گئی۔ M.H Abramsاپنی کتاب A Glossary of Literary Terms میں لکھتے ہیں :

> The term for the novel in most European languages is roman which is derived from the medieval term, the romance. The English name for the from on the other hand is derived novella literally "A little new thing"(1)
>
> (بیشتر یورپی زبانوں میں ناول کے لیے جس اصطلاح کا استعمال ہوتا ہے وہ رومان ہے اور اس ہئیت کا انگریزی نام وسطی دور کی اصطلاحThe Romance(رومانس) سے ماخوذ ہے جب کہ ناول کی اصطلاح اطالوی زبان کے لفظ ناویلا سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی "نئی چیز" کے ہیں۔)

مختلف لغات اور اصطلاحات کی کتابوں میں اس صنف ادب کے معنی اور مفہوم کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں ناول کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> "Novel is a fictious pros narrative or tale of considerable length in which character and actions representative of real life of the past or present times are portraited in a plot in a plot of more or less complexity"(2)
>
> (ناول ایک افسانوی نثر ہے یا ایک حد تک ایسی طویل کہانی جس میں کردار ان کی حرکات و سکنات سے ماضی اور حال کی حقیقی زندگی کی تصویر کشی، سادہ یا پیچیدہ پلاٹ کے توسط سے کی جاتی ہے۔)

اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

> ناول ایک منجمد یاstatic مرکب اکائی نہیں رہا بلکہ اس کی وضع میں ایک نوع کی حرکت پیدا ہو گئی، واقعات یا پلاٹ کے دروبست، تنظیم اور سمت ورفتار کے لحاظ سے بھی اور کرداروں کی ہئیت اور ان کی شخصیت اور محرکات کے اعتبار سے بھی بہ الفاظ دیگر یہ کہئیے کہ ناول کے اسٹرکچر کا پورا منظر نامہ ہی بدل گیا۔ قصہ کہانیوں میں وہ کشش جو تفنن طبع یا وقت گزاری کا وسیلہ سمجھی جاتی تھی۔ اب زندگی میں بصیرت کے حصول اور انسانی کرداروں کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں کے فہم وادراک کے اظہار کے طور پر تیز تر ہو گئیں اور ایسا لگنے لگا کہ ناول کا قصہ یا پلاٹ مختلف سمتوں کی طرف کھلنے اور قاری کو ان سمتوں کی طرف لے جانے کا ایک موثر وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ (۳)

دنیا بھر کے دیگر ممالک کی طرح انگریزوں کی ہندوستان میں بھی حکمرانی اور ان کے نئے نظام حکومت نے نہ صرف مقامی معاشروں کی سماجی اور سیاسی ساخت کو تبدیل کیا، بلکہ ادب، ثقافت، اور دیگر شعبہ ہائے زندگی پر بھی گہرا اور دیر پا اثر مرتب کیا۔ برطانوی نو آبادیاتی نظام کی تشکیل نہ صرف مختلف ممالک کے عوام کی شناخت، نظریات اور سوچ کو متاثر کرنے میں سر فہرست رہی بلکہ اس کے گہرے اثرات اس دور کے ادبی ماحول پر بھی ثبت ہوئے، مختلف ممالک کے ادیبوں نے اپنے اپنے نو آبادیاتی تجربات کو بنیاد بنا کر ادب تخلیق کیا۔ ان ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے نو آبادیاتی نظام کی سوچ اور طرزِ فکر کو ہی اجاگر نہیں کیا بلکہ اس کے اثرات کا مختلف زاویوں سے جائزہ بھی پیش کیا۔

جہاں دیگر زبانوں کی ادبی دنیا نو آبادیاتی نظام کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے وہیں اردو ادب میں بھی انگریزی نو آبادیاتی اثرات کو ناول کی صورت میں پیش کیا گیا۔ اردو ناول کو اسی نظام کی دین کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اردو کے اولین ناول نگاروں نے نو آبادیاتی دور کے تناظر میں اپنے معاشرتی اور فکری تجربات کو ناولوں میں بیان کیا۔ اس حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے نو آبادیاتی دور کے حالات اور اس دور میں پنپنے والی سماجی و اخلاقی قدروں کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ ان کے علاوہ رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، رشیدہ النساء، الطاف حسین حالی، شاد عظیم آبادی اور دیگر ابتدائی ناول نگاروں کے ناولوں میں بھی نو آبادیاتی دور کے اثرات نمایاں ہیں۔

جب ہم اکیسویں صدی کی بات کرتے ہیں تو اردو ناول کی دنیا میں بہت بڑی ترقی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس دور میں کئی اہم ناول لکھے گئے جنہوں نے نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی فکر کو نئے زاویوں سے پیش کیا۔ ان ناولوں میں

شمس الرحمن فاروقی کا ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" خاص اہمیت کا حامل ہے۔ فاروقی اردو ادب کے ایک باکمال ادیب ہیں جنہوں نے اپنے تخلیقی سفر میں کئی اہم ادبی صنفوں میں نمایاں کام کیا۔ ان کا ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" ایک غیر معمولی تخلیق ہے جو مختلف تاریخی اور فکری کثیر الجہت موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

اس ناول کا کینوس بہت وسیع ہے، اور اس میں وزیر خانم کی زندگی کو مرکزی موضوع بنا کر انیسویں صدی کے ہندوستان کی تہذیبی، سماجی، اور سیاسی صورتحال کو صفحۂ قرطاس پر لایا گیا ہے۔ ناول میں مختلف کرداروں اور واقعات کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی سوچ، نوآبادیاتی دور کے اثرات، اور اس دور کی پیچیدگیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں نہ صرف تاریخی و تہذیبی مسائل کو پیش کیا گیا ہے بلکہ اس میں مختلف علوم و فنون کا تذکرہ بھی موجود ہے جو قاری کو گہرے فکری اور علمی مکالمے کی طرف مائل کرتا ہے۔

"کئی چاند تھے سرِ آسماں" کے تناظر میں متعدد نقادوں نے اس ناول کو مختلف زاویوں سے سمجھنے اور تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کی پیچیدگی اور اس میں موجود گہرائی مختلف نظریات اور پہلوؤں سے تشریح و توضیح کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ ناول ایک تہذیبی مرقع ہے جو قدیم ہند اسلامی تہذیب اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ ناول کا مطالعہ مختلف علمی، تاریخی اور ثقافتی جہات کو آشکار کرتا ہے اور قاری پر کئی نئے سوالات کے در وا کرتا ہے اور سوچنے کے زاویے فراہم کرتا ہے۔

یہ ناول بطور سرفہرست ناقدین میں مسلسل زیر بحث ہے، اور اس پر مختلف زاویوں سے تحقیق اور تنقید کا سلسلہ جاری ہے، کیونکہ یہ ایک ایسی تخلیق ہے جو اپنے دائرے میں مختلف النوع فکری، تہذیبی اور تاریخی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا بیان اتنا وسیع اور عمیق ہے کہ یہ قاری کو مسلسل غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اٹھارویں اور انیسویں صدی کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند کی جزئیات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''تاریخ سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ مغلوں کے زوال آمادہ دور میں اور اس کے بعد بھی اکبری بائی ایسی پیشہ وروں کی ''کیسی قدر و منزلت تھی امیر و امراء اپنے بچوں کی تربیت کے لیے ان خواتین کے پاس بھیجا کرتے تھے یہ بچے یہاں آداب و اخلاق سیکھتے ملنے ملانے کے طور طریقوں کے علاوہ علم و ادب میں بھی ہنر مندی پیدا کرتے وزیر خانم کے بچپن کا ایک حصہ اپنی نانی کی رفاقت میں گزرا تھا۔''(۴)

اس مقالے میں ناول کا مابعد نو آبادیاتی(Postcolonial)تناظر میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کسی بھی نظریے کے تحت تجزیہ کسی بھی ادبی فن پارے کی تفہیم کو ایک اہم موڑ عطا کرتا ہے۔ اردو ادب میں مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کی حیثیت دیگر ادبی نظریات یا فکری رویوں کی طرح مسلم ہے، جن کا اطلاق متن پر اس کے تاریخی، تہذیبی، سماجی، سیاسی یا نفسیاتی پس منظر میں کیا جاتا ہے۔ اس مطالعے کا مقصد کسی فن پارے میں موجود تہہ در تہہ معانی کی مختلف جہات کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی کے حوالے سے یہ طریقہ کار ان تخلیقات کی تفہیم کے لیے اپنایا جاتا ہے جو نو آبادیاتی نظام کے تحت تشکیل پانے والے تصورات، استعمار کاروں کی حکمت عملیوں، اور طاقت کے استعماری تصورات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ، یہ مطالعہ ان متون میں مقامی باشندوں کی اُس مخصوص تصویر کو بھی نمایاں کرتا ہے جو نو آبادیاتی طاقتوں نے اپنے تسلط کو مستحکم کرنے کے لیے تخلیق کی تھی۔

برطانوی سامراج نے دنیا کے کئی ممالک پر اپنا تسلط قائم کیا اور ان ممالک کی تہذیبی، ثقافتی اور علمی وراثت کو جان بوجھ کر کمتر اور غیر مہذب قرار دیا۔ انگریزوں نے مقامی باشندوں کو کمزور، جاہل اور غیر مہذب دکھانے کی کوشش کی، جبکہ خود کو ہر لحاظ سے برتر اور زیادہ مہذب ثابت کیا۔ یہ برتری انگریزوں کی سیاسی بالادستی کا ایک واضح نشان تھی، جس کے تحت انہوں نے مقامی باشندوں کے ذہنوں اور خیالات کو نو آبادیاتی سوچ کے تحت تبدیل کیا۔ نو آبادیاتی نظام کے تحت مقامی باشندوں کے علمی و تہذیبی تصورات کو منہدم کرنے کے لیے ایک منظم منصوبہ بندی کی گئی۔ اس منصوبے کا مقصد مقامی لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پختہ کرنا تھا کہ ان کی اپنی تہذیب، اقدار، اور روایات زوال پذیر ہیں، اور ان کی نجات صرف سامراجی نظام کو اپنانے اور اس کی پیروی کرنے میں ہے۔ انگریزوں نے مقامی لوگوں کی نفسیات پر قابو پانے کے لیے یہ تصور عام کیا کہ ان کی تہذیب اور علمی سرمایہ بے کار ہے، اور یہ کہ سامراجی طاقتیں ہی حقیقی ترقی اور تہذیب کا سرچشمہ ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی مطالعہ ایسے متون کی تفہیم کا عمل ہے جن میں نو آبادیاتی نظام اور اس کی حکمت عملیوں کو موضوع بنایا گیا ہو۔ اس تناظر میں متن کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح استعمار کار نے اپنی طاقت کو قائم رکھنے کے لیے مقامی باشندوں کے ذہنوں میں ایک مخصوص شبیہ پیدا کی۔ یہ شبیہ ان کے سماجی، ثقافتی، اور سیاسی اداروں کو غیر اہم، کمتر اور زوال آمادہ ثابت کرتی تھی، تاکہ استعمار کار کی برتری کو قبول کیا جا سکے۔

یہ مطالعہ اس بات کی طرف بھی نشان دہی کرتا ہے کہ کس طرح نو آبادیاتی نظام نے مقامی باشندوں کو ذہنی و فکری غلامی میں مبتلا کیا اور ان کے ادبی و تہذیبی ورثے کو نظر انداز یا مسخ کیا۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعے کا مقصد

ان سامراجی ہتھکنڈوں کو بے نقاب کرنا ہے جنہوں نے مقامی ثقافتوں اور ان کے باشندوں کو ایک کمزور اور کم حیثیت مقام پر لا کھڑا کیا۔یوں، مابعد نو آبادیاتی تنقید کے ذریعے کسی بھی فن پارے میں موجود نو آبادیاتی اثرات اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والی فکر و سوچ کا باریک بینی سے جائزہ لیا جاتا ہے، تاکہ استعمار کے طاقتور اور استحصالی نظام کی گہرائی کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکے۔اس طریقے سے متن کی تہہ در تہہ معنوی جہات کو اجاگر کیا جاتا ہے، اور سامراجی استحصالی قوتوں کی تشکیل کردہ نظریاتی و فکری دھاروں کو منظر عام پر لایا جاتا ہے۔

میں مابعد نو آبادیات Dictionary of Literary Terms & Literary Theory تعریف اس طرح کی گئی ہے:

> "Postcolonialism is an interdisciplinary academic field devoted to the study of European colonialism and its impact on the society, culture, history and politics of the formerly colonized regions such as the African continent, the Caribbean, the Middle East, South Asia and the Pacific."(5)

(مابعد نو آبادیات ایک بین العلومی علمی شعبہ ہے جس میں یوروپی نو آبادیات کے مطالعے کے ساتھ سابقہ نو آبادیاتی خطے مثلاً افریقی براعظم کیریبین، مشرق وسطی، جنوبی ایشیا اور بحر الکاہل کے سماج، تہذیب، تاریخ اور سیاست پر پڑنے والے اس کے اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔)

ناصر عباس نیر مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "نو آبادکار، نو آبادیاتی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم ہی نہیں کرتا، نو آبادیاتی باشندوں کی دنیا کو تشکیل بھی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نو آبادیاتی باشندوں کی دنیا ان کی اپنی دنیا نہیں ہوتی، انہیں اپنی دنیا پر کوئی تصرف اور اختیار نہیں ہوتا، نہ اس دنیا کے حقیقی عملی معاملات پر اور نہ اس دنیا کے تصور اور اس کے نظام اقدار پر۔ وہ اپنی ہی دنیا میں اجنبی، اور اس سے باہر ہوتے ہیں۔ غضب یہ کہ نو آبادیاتی باشندے کو نو آبادکار جو تصور ذات دیتا ہے وہ اسے بالعموم قبول کرتا ہے اور اس کے مطابق جینا شروع کر دیتا ہے اور نو آبادیاتی دنیا میں جو کردار اسے ادا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، وہ اسے عموماً تسلیم کر لیتا ہے۔"(۶)

نو آبادیاتی نظامِ افکار کا مطالعہ بذاتِ خود ایک وسیع اور پیچیدہ موضوع ہے، جس کی تفہیم مختلف علمی و فکری شعبوں کے تحت کی جاتی رہی ہے تاکہ سامراجی طاقتوں، بالخصوص برطانوی استعمار، کے ترتیب دیے گئے منصوبوں اور حکمت عملیوں کو درست طور پر سمجھا جاسکے۔ اس تناظر میں، شمس الرحمن فاروقی کا ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" اہمیت کا حامل ہے، جہاں کہانی کا محور وزیر خانم کی زندگی ہے، جو نو آبادیاتی زمانے میں ایک ایسی شخصیت کے طور پر پیش کی گئی ہے جو برطانوی اثر و رسوخ کے تحت اپنی مشرقی شناخت اور روایات کے برعکس غیر رسمی تعلق بناتی ہے۔ ناول میں وزیر خانم کی زندگی میں پہلا مرد، مارسٹن بلیک، جو ایک انگریز ہے، اس نظام کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ مارسٹن بلیک، وزیر کو کسی رسمی نکاح یا قانونی کارروائی کے بغیر اس کے والد کی مرضی سے اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور وزیر خانم کو اپنے گھر کی ملکہ بنالیتا ہے۔ یہ صورت حال برطانوی استعمار کے ہندوستان پر قبضے کی ابتدائی کوششوں کی عکاسی کرتی ہے، جہاں انگریز اپنی طاقت اور اثر و رسوخ کے ذریعے مقامی افراد کی زندگیوں اور ان کی روایات کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصنف نے اس دور کی تاریخی حقیقتوں کو ناول میں شامل کیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے کس طرح اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے مقامی سماج کے اصولوں کو نظر انداز کیا۔ وزیر خانم، جو ایک خالص مشرقی روایت کی پروردہ خاتون ہے، تھوڑے ہی عرصے میں مارسٹن بلیک کے ساتھ غیر رسمی تعلقات استوار کر لیتی ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ نو آبادیاتی نظام کس طرح مقامی تہذیب اور روایات کو مسخ کر رہا تھا۔ وزیر حانم کے والد، جو کہ مشرقی تہذیب کے نمائندہ فرد ہیں، اپنے معاشرتی اصولوں کے برخلاف، بغیر کسی نکاح یا کاغذی کارروائی کے اپنی بیٹی کو مارسٹن بلیک کے ساتھ رخصت کر دیتے ہیں۔ اس واقعے میں نہ صرف نو آبادیاتی نظام کے تحت مقامی باشندوں کی اپنی تہذیب سے دوری اور احساسِ کمتری کو نمایاں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کس طرح انگریزی تہذیب کو برتر اور قابلِ تقلید سمجھا جانے لگا تھا۔

وزیر خانم کے والد کا یہ عمل، نو آبادیاتی غلامی کی ایک اہم علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ یہ عمل مشرقی تہذیب اور اقدار کی کمتری اور انگریزوں کی برتری کو واضح کرتا ہے۔ مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہر وہ چیز جو انگریزی تہذیب کا حصہ ہے، اسے نہ صرف مقامی روایات سے زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے، بلکہ مقامی افراد اپنی روایات اور تہذیبی اصولوں کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وزیر خانم کے والد کا بغیر کسی اعتراض یا سوال کے اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے بلیک کے ساتھ بھیجنا، اس بات کا مظہر ہے کہ نو آبادیاتی نظام نے کس طرح مقامی لوگوں کو اپنے تہذیبی ورثے پر شک کرنے اور سامراجی نظام کو زیادہ برتر ماننے پر مجبور کیا۔

یہ کہانی نو آبادیاتی تسلط کے دوران پیدا ہونے والے ذہنی اور فکری تضادات کو اجاگر کرتی ہے، جہاں مقامی باشندے اپنی تہذیبی شناخت سے دور ہو کر استعمار کے نظام کو اپنانے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ ناول کا یہ حصہ برطانوی سامراج کے اُس دور کی نمائندگی کرتا ہے جب نو آبادیاتی حکومت نے مقامی سماج، سیاست اور ثقافت کو اپنے نظام کے تحت ڈھالنے کی کوشش کی۔ ناول سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس واقعے کے بعد مارسٹن بلیک کسی نہ کسی تقریب سے ہر دو تین دن پر وزیر خانم کے گھر پہنچ کر سیر و تفریح کی باتیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ اسے چاندنی چوک اور نہر کی سیر کے لیے لے جاتا۔ ماں تو تھی نہیں، باپ ان کے ساتھ ہوتا لیکن طوعاً و کرہاً، اور بیٹی کو پوری چادر لپیٹ کر باہر جانے پر ہمیشہ اصرار کرتا۔ پھر بھی اسی اثنا میں وزیر خانم سے اس کے چپکے چپکے کیا مراسم بنے یا کیا عہد و پیماں ہوئے، اس کا کچھ پتہ نہیں۔۔ مارسٹن بلیک کی باتیں سن کر سب لوگ کچھ دیر کے لیے خاموش سے ہو گئے۔۔۔ کچھ ادھر کا بھی اشارہ دیکھ کر بلیک اور محمد یوسف خاموشی سے ایک طرف کو ہو لیے، سرگوشیوں میں کچھ گفتگو ہوئی۔''(۷)

اس اقتباس میں راوی کا یہ بیان "باپ ان کے ساتھ ہوتا لیکن طوعاً و کرہاً" وزیر خانم کے والد کی بے بسی اور مجبوری کو اجاگر کرتا ہے۔ اس جملے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ دل سے اپنی بیٹی کو انگریز کے ساتھ بھیجنے پر راضی نہیں تھا، مگر حالات کے جبر اور سامراجی طاقتوں کے سامنے مجبور ہو کر اس نے یہ فیصلہ کیا۔ ایک طرف اس میں کسی انگریز کی خواہش کو مسترد کرنے کی جرات نہیں تھی، تو دوسری طرف وہ اپنی تہذیب کی باقی ماندہ کشش کو بھی محسوس کر رہا تھا، جو اسے اپنی روایات اور اقدار کی طرف کھینچ رہی تھی۔ مگر اس دوہرے دباؤ کے زیرِ اثر، وہ انگریزوں کی خواہشات کے سامنے سر جھکا لیتا ہے۔ اس کے بعد جو پس پردہ آہستہ آہستہ گفتگو ہوتی ہے اور اسے راز رکھا جاتا ہے، وہ حاکم اور محکوم طبقوں کی دوہری ترجیحات کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ پیٹھ پیچھے ہونے والی گفتگو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ کس طرح سرمایہ کاروں نے مقامی باشندوں کو اپنی حقیقی خواہشات اور جذبات کا اظہار کرنے سے روک دیا تھا، اور وہ محض مجبور تھے کہ اپنی ذاتی زندگی کے فیصلے بھی سامراجی حکام کے مفادات کے مطابق کریں۔ اسی نو آبادیاتی دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیر خانم، بلیک کے ساتھ جے پور روانہ ہو جاتی ہے، جو اس کے اور اس کے خاندان کے لیے ایک بڑی تبدیلی تھی۔ اس کے بعد لندن میں خلیل اصغر فاروقی، جو ایک ماہر امراضِ چشم ہیں، کی ملاقات وسیم جعفر سے ہوتی ہے۔ اس ملاقات کے دوران فاروقی کو پتا چلتا ہے کہ وزیر خانم وسیم جعفر کی دادی تھیں۔ وسیم جعفر، فاروقی کو نہ صرف وزیر خانم کی زندگی بلکہ اس دور کے متعلق بھی بہت سی اہم معلومات فراہم کرتے ہیں،

جن میں خانم کی تصویر کا ذکر اور اس کی تلاش کا قصہ بھی شامل ہے۔ اس معلومات کے تبادلے کے ذریعے دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور ماضی کے راز افشا ہوتے ہیں۔ اسی اثنا میں ایک دن وسیم جعفر اور فاروقی انگریزوں کے ہندوستانیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک پر گفتگو کرتے ہیں۔ وسیم جعفر اس بحث میں سر سید احمد خان اور سید محمود کے بیانات کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان بیانات میں سید محمود کی بات کو سادہ لوحی نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نو آبادیاتی دور میں ہندوستانی عوام نہ صرف سیاسی طور پر بلکہ نفسیاتی طور پر بھی خود کو انگریزوں کی رعایا تسلیم کر لیا تھا۔ وہ اپنے عزت و وقار کو برقرار رکھنے کی ناکام کوشش میں خوش فہمی کے پردے میں چھپ رہے تھے، مگر اندر سے وہ سامراجی طاقت کے غلام بن چکے تھے۔ المختصر یہ اقتباس نو آبادیاتی دور کی پیچیدگیوں اور سامراجی نظام کی گہرائیوں کو ظاہر کرتا ہے، جہاں مقامی افراد ذہنی طور پر بھی اپنے آپ کو کمتر اور انگریزوں کو برتر تسلیم کر چکے تھے۔ اس میں نو آبادیاتی نظام کے نفسیاتی اثرات کا بھی ذکر ہے، جو مقامی لوگوں کو اپنی تہذیب سے دور کر کے انہیں سامراجی اقدار کو اپنانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس حوالے سے ذیل میں دیے گئے اقتباس میں وسیم جعفر کے خیالات ملاحظہ ہوں:

> ''سر سید کی بات میں کچھ صداقت تھی۔ وسیم جعفر نے کہا۔ اپنے بجنور والے رسالے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کے دل میں اس بات کا بہت غصہ تھا کہ فرنگی لوگ ہمارے ساتھ برابر کا سلوک تو دور رہا، انسانی سلوک بھی نہیں کرتے۔ اس بات کو بڑے عجیب و غریب انداز میں سید محمود نے بنارس میں ۱۸۹۱ کی ایک تقریر میں کہا کہ انگریزوں کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ حاکم ہیں اور ہم رعایا۔ رعایا ہم دونوں ہیں۔ ملکہ عالیہ ہماری حاکم ہیں، اور ان کی رعایا کی حیثیت سے ہم دونوں برابر ہیں، برابر کے حقوق و فرائض و مراعات رکھتے ہیں۔''(۸)

وزیر خانم کے والد یوسف ناول "کئی چاند تھے سر آسماں" میں واحد متکلم راوی کے طور پر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں، جس میں وہ اپنے آباؤ اجداد کی زندگی کے حالات اور وزیر خانم کے کردار کے مختلف پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ ادب کے تخلیق کار جانتے ہیں کہ کردار سازی ناول کے پیچیدہ بیانیے کی پرتیں کھولنے میں نہایت اہمیت رکھتی ہے، اور یہی کردار کہانی کو نہ صرف ایک واضح معنی فراہم کرتے ہیں بلکہ اس کے پلاٹ کو بھی تشکیل کرتے ہیں۔ کردار کی ذہنی سطح اور اس کے حرکت و عمل سے ہی قاری میں غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

وزیر خانم کے کردار کو سمجھنے کے لیے اس کے بچپن کے مناظر اور اعمال معاون ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر شروع سے ہی باغیانہ عناصر موجود تھے۔ جیسا کہ یوسف سادہ کار کہتا ہے: "بچپن سے ہی اس کے مزاج میں ایساڈومنی پن تھا کہ میں اسے دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔" گیارہ سال کی عمر میں ایسے رویے بظاہر ناقابل یقین معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید وراثت میں ملے ہوئے خصائص اور نانی کے گھر گزارا ہوا وقت اس کی شخصیت پر اثرانداز ہوئے ہوں، یا یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ چیزیں فطرتی طور پر انسان کی طبیعت میں موجود ہوتی ہیں۔ وزیر خانم اپنے باغیانہ رویے کی وجہ سے مشرقی روایات و اقدار سے انحراف کرتی ہے اور اکثر ان پر تنقید کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ روایات جو برصغیر کی تہذیب کا لازمی حصہ ہیں، خاص طور پر نکاح، شادی بیاہ کی اہمیت، اور مردوں کی بالادستی، ان سب سے وہ کھلم کھلا انکار کرتی ہے۔ اس ضمن میں وزیر خانم کی اپنی بہن کے ساتھ گفتگو خاصی تانیثی (feminist) رنگ لیے ہوئے ہے، جس میں وہ مردانہ تسلط اور روایتی ازدواجی نظام کو چیلنج کرتی ہے۔ یہاں نوآبادیاتی فکر کے اُس پہلو کو اجاگر کیا جاسکتا ہے کہ مغربی نظامِ فکر میں شادی بیاہ کو معاشرتی وقار کا لازمی حصہ نہیں سمجھا جاتا۔ مغرب میں شادی کرنے یا نہ کرنے سے فرد کے سماجی مرتبے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ وہاں شادی ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور ہر فرد کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی گزارے یا بغیر شادی کے ایک دوسرے سے تعلق قائم رکھے۔ مغربی معاشرے میں اچھائی اور برائی کے پیمانے مشرق سے کافی مختلف ہیں، اور یہ مغربی نظریات وزیر خانم کے کردار میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس طرح، وزیر خانم کا کردار مشرقی اور مغربی نظریات کے مابین تضاد کی ایک جھلک فراہم کرتا ہے، جو اسے ناول کے مرکزی خیال سے جوڑتا ہے اور اُس وقت کی نوآبادیاتی سوچ کو بیان کرتا ہے۔ وزیر خانم کے کردار کی خصوصیات اور شخصیت ذیل میں دیے گئے اقتباسات سے اجاگر ہوتی ہیں:

> ''سنیے، میں شادی وادی نہیں کروں گی۔ وزیر نے مربیانہ لہجہ میں کہا۔ کیوں؟ کیوں نہیں کرے گی شادی؟ اور نہ کرے گی تو کیا کرے گی؟ لڑکیاں اسی لیے تو ہوتی ہیں کہ شادی بیاہ ہو گھر ہو۔''(۹)

> ''دیکھو باجی جان۔ شادی کر کے میں خواہی نخواہی خود کو زندگانی بھر کے لیے کیوں پھنساؤں تعلق وہی اچھا جس کو توسکوں۔
> ہائے اللہ یہ تو کیا بک رہی ہے۔ یہ تو سراسر کفر ہے!۔''(۱۰)

"عورت کے لیے مرد ضروری ہے۔ مرد کے لیے عورت ناموس ہے اور عورت کے لیے مرد وارث چلیے وارث ہی سہی۔ لیکن نکاح تو ضروری نہیں۔" تو کیا حرام کاری کرے گی؟ لڑکی خدا سے ڈر" شاہزادہ تقدیر میں لکھا ہو گا تو آئے گا ہی نہیں تو نہ سہی۔ مجھے جو مرد چاہے گا اسے چکھو گی، پسند آئے گا تو رکھوں گی نہیں تو نکال باہر کروں گی۔"(۱۱)

مارسٹن بلیک کا وزیر خانم کو بغیر نکاح یا عیسائی مذہبی رسوم کے ساتھ لے جانا دراصل اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس نے وزیر کو محض ایک گھریلو عورت، دل لگی کا ذریعہ اور اپنی خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ سمجھا تھا۔ وہ اسے اپنی بیوی کا درجہ دے کر اپنی عزت اور انگریزی قوم کی نظروں میں اپنے مقام کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ بلیک کے نزدیک اپنی عزتِ نفس اور سماجی رتبہ زیادہ اہمیت رکھتا تھا، اور اس نے جان بوجھ کر وزیر خانم کو رشتۂ ازدواج میں شامل نہیں کیا تاکہ اپنے مقام کو برقرار رکھ سکے۔

وزیر خانم کے دل میں بے شمار اندیشے تھے، اور وہ اکثر اس بے نام رشتے پر غور کرتی تھی، لیکن اپنے آپ کو تسلی دے دیتی تھی۔ اس حوالے سے فرانز فینن نے اپنی کتاب "Black Skin, White Masks" میں استعمار کاروں کے طرزِ فکر اور خصوصاً گورے اور کالے افراد کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے، خاص طور پر نفسیاتی پس منظر میں۔ کتاب کے دوسرے باب "The Woman of Color and the White Man" میں فرانسیسی ناول "Je Suis Martiniquaise" کی مرکزی کردار میوٹ کے ذہنی رویے کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے، جس میں میوٹ کا یہ خیال ہے کہ گورا آدمی کالی عورت سے شادی نہیں کرتا، اور یہ بات اس کی ذاتی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ تاہم، میوٹ گورے عاشق کے ساتھ رہنے کی خواہش رکھتی ہے کیونکہ وہ اس کی ظاہری خوبصورتی اور نیلی آنکھوں سے مرعوب ہے۔ یہ محبت دراصل محکوم ذہن کی غلامانہ ذہنیت اور لایعنی مرعوبیت کی عکاسی کرتی ہے۔

وزیر خانم اور مارسٹن بلیک کے تعلق میں بھی ایسی ہی نوعیت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ وزیر خانم بلیک کی دی ہوئی ظاہری آسائشات اور محبت کو اپنی زندگی کا کل سرمایہ سمجھ کر خود فریبی کا شکار ہوتی ہے۔ وہ جہاں ایک طرف بلیک کے ساتھ خوش رہنے کی کوشش کرتی ہے، وہیں دوسری طرف اپنے اس غیر رسمی اور بے نام رشتے کی نوعیت اسے اندرونی کشمکش میں مبتلا رکھتی ہے۔ وہ خود کو ہر لمحہ یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ بلیک اس سے سچی محبت کرتا ہے، لیکن بلیک سے اپنی محبت کے حقیقی جواز کو وہ کبھی تلاش نہیں کر پاتی۔ آخر کار، وزیر خانم کی سوچ بلیک کی فراہم کردہ آسائشی زندگی اور ان تمام سہولیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ یہ مرعوبیت، اور بلیک کی فراہم کردہ عیش و عشرت سے متاثر ہو کر، اس کے ذہن میں استعمار زدگی کا احساس واضح ہوتا ہے۔ وہ انگریز کے مقابلے میں اپنے ملک

کے نوابین اور ان کی سماجی و معاشی حیثیت کو بے وقعت سمجھنے لگتی ہے۔ دراصل، یہی کمتری کا احساس بلیک کے ساتھ اس کے رشتے کی اصل بنیاد فراہم کرتا ہے، اور اسے اس محبت میں خوش رہنے کا حقیقی جواز فراہم کرتا ہے۔ اس کی انہی نفسیاتی کیفیات کے حوالے سے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"آئندہ کچھ بھی ہو، ابھی تو میں چین سے ہوں۔ دولت کی بہت فراوانی نہیں تو کمی بھی نہیں اپنی ہم چشموں میں عزت نہیں تو غیروں اور کم اصلوں میں تو رعب داب ہے۔ چالیس پچاس نوکر ہیں کیسا پھر کی بنے میرے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ میں فرنگی بی بی ہی نہیں، جے پور شہر کی نمودار ہستیوں میں ہوں اور سب بیبیوں میں حسن اور سلیقے کے سبب ممتاز بھی ہوں میرا صاحب بھی مجھے چاہتا ہے، نوکر چاکر خوش، بیوپاری مہاجن ادب کرتے ہیں، دہلی والی بیگم کے لقب سے ملقب ہوں اور کسی کو کیا چاہیے؟ میں عمدہ باجی سے تو اچھی ہوں ان نواب لوگوں کا کیا بھروسہ، یہ سب ریجھ بچاؤ ہیں۔ ان کی اصل لاگ اور اصل مطلب کس سے ہے یا کس سے ہو جائے گی، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا اور پھر اس نوابی کا کیا ہے ابھی تو مسند پر براجے نہیں ہیں۔۔۔ یہ ساری پلٹن کی پلیٹن میری مطیع ہے جسے چاہوں رکھوں جسے چاہوں نکالوں۔"(۱۲)

"وزیر خانم کے ذہنی رویے کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ قرابت داروں اور ہم چشموں کے درمیان اپنی بے عزتی کو بآسانی قبول کر لیتی ہے کیوں کہ انگریز کی صحبت اسے احساس برتری میں مبتلا رکھتی ہے یہاں تک کہ اپنی بڑی بہن کا ساس سسر کی خدمت، شوہر بچوں کی ناز برداریاں اور دیگر امور خانہ داری کے فرائض انجام دینا اسے قابل رحم معلوم ہوتا ہے۔ گویا نو آبادیاتی فکر، ) نو آبادیاتی اقوام کو اپنے تہذیبی تشخص سے انحراف کو ترجیح دیتے ہوئے کردار کی ذہن سازی کا کام انجام دیتی ہے جس میں کردار، انگریز، انگریزی نظام یا انگریزی تہذیب کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے اور ان کی موجودگی کو سایہ عاطفت تصور کرتا ہے فرانز فینن کے مطابق اس کے "The So-Called Dependency Complex Of Colonized People" کو زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ محمد نعیم، فرانز فین کے حوالے سے اپنی کتاب اردو ناول اور استعماریت میں لکھتے ہیں "فرانز فینن نے استعماریت کے عمل میں استعمار کار اور استعمار زدہ کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے دونوں کو مختلف

طرح کی تعقید (Complex) کا شکار قرار دیا ہے۔ استعمار کار، تحکمانہ تعقید (Authority Complex) کا اور استعمار زدہ محتاجی تعقید (Dependency Complex) کا شکار ہوتا ہے۔ اور وزیر محتاجی تعقید کا شکار معلوم ہوتی ہے۔"(۱۳)

وزیر خانم میں انگریزی طور طریقے سیکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت موجود تھی۔ وہ جلد ہی کھانے کے دوران چھری اور کانٹے کا استعمال بھی مہارت سے سیکھ لیتی ہے، جو اس کی انگریزی طرز زندگی میں تیزی سے ڈھل جانے کی علامت ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ مارسٹن بلیک کے ساتھ رہتی ہے، اس پر عیاں ہونے لگتا ہے کہ بلیک کے دل میں ہندوستانی قوم کے لیے گہری نفرت پائی جاتی ہے۔ انگریزی حکام نو آبادیاتی اقوام کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتے ہیں جس میں وہ مقامی تہذیب و ثقافت کو پسماندہ اور بگڑی ہوئی قرار دیتے ہیں، جبکہ اپنی قوم کو مہذب، ترقی یافتہ اور علم و دانش کا حامل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نو آبادیاتی اقوام کو اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے انگریزی افکار اور طرزِ زندگی کی پیروی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ انگریز مشرقی تہذیب کے تصورات اور روایات کو کمتر اور ناقص قرار دیتا ہے۔ مارسٹن بلیک بھی اس طرز فکر سے متاثر ہو کر ہندوستانی باشندوں کے لیے اپنی ناپسندیدگی اور حقارت کا اظہار کرتا ہے۔ راوی کے بیان کے مطابق، بلیک کا یہ رویہ اس کی نو آبادیاتی ذہنیت کا مظہر ہے، جو ہندوستانی لوگوں کو کم تر اور خود کو برتر سمجھتا ہے۔ وزیر خانم کو اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ بلیک کی یہ سوچ اور نفرت نہ صرف اس کے دل میں موجود ہے بلکہ یہ پوری نو آبادیاتی حکمت عملی کا حصہ ہے جس کے تحت مقامی لوگوں کو ذہنی، سماجی اور ثقافتی طور پر غلام بنایا جاتا ہے۔ راوی نے ناول میں اس صورت حال کو یوں پیش کیا ہے:

"مارسٹن بلیک کے خیال میں ہندوستان کے لوگ عموماً غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب تھے۔ وہ یہاں ریت رسم کی کثرت پر ہنستا تھا اور کہتا تھا کہ دولت اور عزت دونوں گنوانے کا اچھا طریقہ تم لوگوں نے نکالا ہے۔ یہاں تک تو شاید کچھ ٹھیک بھی تھا لیکن مارسٹن بلیک کے ہم قوموں کے دل میں ہند اور اہلِ ہند کی باتوں، ان کی معیشت و معاشرت، ان کے خیالات و عقائد، ان کے مذہب کسی چیز کی قدر نہ تھی۔ اور سب سے بدتر یہ کہ مارسٹن بلیک کے لفظوں سے نہیں، اشاروں سے بھی نہیں لیکن ہندوستان میں اس کے رہن سہن کے انداز، اور یہاں کی دولت سے متمتع ہونے کے طور طریقوں سے دو باتیں بالکل صاف نظر آتی تھیں۔ ایک تو یہ صاحبان فرنگیان یہاں کی دولت بٹور نے آئے تھے اور دوسری بات یہ کہ اگر دولت

بٹورنے کی لیے یہاں حکمرانی بھی کرنی پڑے تو وہ اس کے لیے بھی سارے جوڑ توڑ، ساری جنگ اور ساری سازش، ہر طرح کی راہیں اختیار کرنے پر آمادہ اور مستعد تھے۔"(۱۴)

درج بالا اقتباس کی چند آخری سطروں میں راوی کی بیان کردہ باتیں خود انگریزوں کی سازشوں اور ان کے طرزِ فکر کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں، جو ان کے حقیقی مقاصد کو بھی واضح کرتی ہیں۔ وزیر خانم، جو ابتدا میں ان کے داؤ پیچ سے بے خبر ہوتی ہے، رفتہ رفتہ ان کی چالاکیوں کو سمجھنے لگتی ہے اور ان کے بعض رویوں سے گھن بھی محسوس کرتی ہے، مگر اس کے باوجود مارسٹن بلیک کے لیے اس کے دل میں پسندیدگی باقی رہتی ہے۔ بلیک کی صحبت میں رہنے سے وزیر خانم انگریزی تہذیب سے بخوبی واقف ہو جاتی ہے۔ وزیر خانم شروع سے ہی بے باک اور خود اعتماد تھی، لیکن انگریزی تہذیب کے رنگ میں رنگ جانے کے بعد اس کے اندر مزید نخوت اور تمکنت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ اس مغربی طرزِ زندگی کو اپنا کر اپنے انداز کو بہتر طریقے سے ڈھال لیتی ہے۔ مثال کے طور پر، اجنبیوں یا بزرگوں سے نگاہ ملا کر بات کرنا مغربی تہذیب کا حصہ ہے، جبکہ ہندوستانی تہذیب میں اس کے برعکس نظریں نیچی رکھ کر بات کرنا احترام کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وزیر خانم اس بات سے آگاہ ہونے کے باوجود، نواب شمس الدین سے گفتگو کرتے وقت مغربی طرز اپنانے کو ترجیح دیتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ وزیر خانم کے طور طریقوں میں اکثر مقامات پر انگریزی تہذیب کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے، جیسے نکاح کی پہلی رات وہ خود مرزا فخرو کے ہاتھ کو اپنی گردن میں حمائل کر لیتی ہے۔ یہ طرزِ عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ وزیر خانم نے مغربی تہذیب کے طور طریقے اپنانے میں کس حد تک مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں ناول میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مابعد نو آبادیاتی مطالعہ ایک وسیع اور جامع میدان ہے، جس میں تاریخ، تہذیب، ادب اور دیگر اہم موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ان کا تجزیہ سامراجی نظام اور انگریزی فکر کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔ نو آبادیاتی نظریات نے فکری سطح پر لوگوں کے سوچنے، دنیا کو سمجھنے اور اسے دیکھنے کے انداز کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا، جو ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ اپنی برتری اور افضلیت کے دعوے کو فروغ دیتا ہے۔ اس پس منظر میں کردار کی سوچ، رویوں اور شخصیت کا مطالعہ مابعد نو آبادیاتی تنقید کا ایک اہم پہلو تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ سامراجی اثرات اور ان کی عمیق نفسیاتی پیچیدگیوں کو سامنے لاتا ہے۔

# حوالہ جات


1. Abrams M.H A Glossory of literary terms,10 edition New Delhi 2013 p 25

۲. آکسفورڈ انگلش ڈکشنری انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا دوم۱۶، ص ۶۷۳، بحوالہ ترقی پسند اردو ناول ڈاکٹر انور پاشا پیش رو پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص۸

۳. صدیقی، عقیل احمد، کارگہ کوزہ گراں نئی دہلی، براؤن کلب پبلیکیشنز۲۰۱۴ء، ص۲۷۸

۴. قدیر زماں وزیر خانم، تلخیص و تبصرہ، ص15 فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، حیدر آباد، ۲۰۱۰ء

5. Cuddon, J.A – Dictionary of Literary Terms & Literary Theory 5thedition, London: Penguine Books 2014

۶. نیر، ناصر عباس لسانیات اور تنقید، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند ۲۰۱۵ء، ص۳۳

۷. فاروقی شمس الرحمن کئی چاند تھے سر آسماں، لندن، پینگوئن بکس ۲۰۱۳ء، ص۱۷

۸. ایضاً، ص۳۵

۹. ایضاً، ص۱۷۶

۱۰. ایضاً ص۱۷۷

۱۱. ایضاً، ص۱۷۸

۱۲. ایضاً۱۸۹۔۱۹۰

۱۳. ایضاً ص۱۷۸

۱۴. نعیم محمد، اردو ناول اور استعماریت انیسویں صدی کے ناول کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ، لاہور: کتاب محل